© rasailojaraid.com

عالم اسلام اور جدت پسندی

مدیر کے قلم سے

"جدیدیت" کی اصطلاح قدیم خیالات وروایات کے مقابلے میں لائی گئی ہے، عالم اسلام میں ان مفکرین نے اسے بہت پھیلایا جو عصر جدید میں غیر مسلم اقوام کی مادی ترقی سے مرعوب ہوئے اور اسلام کے مادی تنزل نے انہیں اسلام کے ورثہ سے متعلق ایک گونہ احساس کمتری میں مبتلا کیا، ان مفکرین کی آنکھیں جب اقتصادی اعتبار سے ترقی یافتہ اقوام کی مادیت سے چکاچوند ہوئیں تو یہ اس مادی ترقی کا راز، ان کی تہذیب وتمدن میں تلاش کرنے لگے اور ان کی تہذیب وگلیمر کے دلدادہ ہوگئے، اب جہاں جہاں اسلامی تہذیب، اسلامی تعلیمات اور اسلامی اقدار کا تصادم ان تہذیبوں سے نظر آیا، وہاں یہ دونوں کے درمیان جوڑ پیدا کرنے کے لیے "پیوندکاری" کے عمل میں مشغول ہوگئے تاکہ اسلام ان ترقی یافتہ قوموں کی تہذیب میں ایڈجسٹ ہوسکے۔

جدیدیت عالم اسلام سے بھی پہلے عیسائی دنیا پر حملہ آور ہوئی اور اس نے تحریف شدہ کمزور عیسائی مذہب کے پورے ڈھانچے کو شکست وریخت سے دوچار کیا، اس کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں اور اہل کلیسا کو الحاد کی طرف دھکیلنے میں پوری طرح کامیاب ہوئی، تیرہویں سے سترھویں صدی تک یورپ میں چرچ کے اقتدار اور تنگ نظری کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا ہوچکے تھے، اس دور میں یورپ میں "رینی ساں" اور "ریفارمیشن" کی تحریکیں چلیں جن میں چرچ پر بھرپور تنقید کی گئی۔ اسی دوران مارٹن لوتھر کی مشہور پروٹسنٹ تحریک بھی چلی جس نے دنیائے عیسائیت کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ یورپ میں ایسے مفکرین بھی پیدا ہونے لگے جن کی تحقیقات نے ارسطو اور افلاطون کے ان سائنسی نظریات کو بھی چیلنج کردیا جنہیں اہل کلیسا نے طویل عرصے سے مذہبی عقائد کا حصہ بنایا ہوا تھا، ان میں سب سے مشہور زمین کے کائنات کا مرکز ہونے اور اس کے ساکن ہونے اور سورج اور تمام اجرام فلکی کے زمین کے گرد گھومنے کا نظریہ تھا، ان مفکرین میں لیونارڈ وڈاونسی (1519ء۔ 1452ء)، جیارڈینو پرونو (1600ء 1548ء) گلیلیو (1642ء1564ء) جوہانس کپلر (1630ء۔ 1571ء) زیادہ مشہور ہیں۔ مذہبی علما نے ان تنقیدی اور جدید نظریات کا سختی سے نوٹس لیا۔ انہوں نے عقل ومنطق اور مشاہدے کی بنیاد پر حاصل ہونے والے سائنسی علم کو طاقت سے دبانا چاہا۔ احتساب کی مشہور عدالتیں قائم ہوئیں جو اس قسم کے نظریات رکھنے والے مفکرین کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سخت سزائیں دیتیں۔ برونو کو کئی سال قید میں رکھنے کے بعد آگ میں زندہ جلا دیا گیا۔ گلیلیو کو اپنے عقائد سے توبہ کرنا پڑی ورنہ اسے بھی موت کی سزا سنا دی گئی تھی:

روشن خیالی مغرب کے ایک مستقل مکتب فکر یا تحریک کا نام ہے جسے تحریک تنویر یا ان لائٹن منٹ بھی کہا جاتا ہے جو اٹھارویں صدی کی پیداوار ہے۔ یہ تحریک عیسائیت کی مذہبی پابندیوں کے ردعمل کے طور پر وجود میں آئی اور اس کی بنیاد الحاد پر ہے۔ مغرب الحاد کی راہ پر چلنے کے بعد بچی کھچی الہامی تعلیمات سے بھی دستبردار ہو گیا اور اس نے زندگی کے لیے اصول بنانے کا کام عقل کے حوالے کیا۔ ایک ایسی عقل جو ملحد ہو، ایمان بالغیب اور آخرت پر یقین نہ رکھتی ہو، زندگی گذارنے کے لیے جو اصول بنا سکتی ہے، وہ اصول وقوانین بنائے گئے اور ان کی روشنی میں انسانی حقوق کا تعین کیا گیا...... اس وضع وہیئت میں اس فانی مادی دنیا سے زیادہ سے زیادہ لذت کشید کرنے کو بنیادی اہمیت حاصل رہی......
کسی انسان کا عقیدہ ہی اگر یہ ہے کہ اسے مرنے کے بعد کسی اور زندگی کا سامنا کرنا ہے اور نہ ہی دنیا میں گذرنے والی زندگی سے متعلق اس سے پوچھ گچھ ہو گی، اس کا نظریہ اس دنیوی زندگی کو اپنی پہلی اور آخری زندگی سمجھنے کا ہو تو اس کی پہلی اور آخری خواہش بھی یہی ہو گی کہ وہ اسے عیش وعشرت اور راحت وآرام کے ساتھ بسر کرے، جو وسائل کی فراوانی اور کھلم کھلا آزادی کے بغیر ممکن نہیں۔ چنانچہ الحاد سے نکلنے والی روشن خیالی کا ''لوگو'' ہی آزادی اور ترقی ہے۔ انسانی حقوق کا بین الاقوامی منشور اسی ملحدانہ فضا میں مرتب کیا گیا ہے۔ اس منشور اور مغرب سے متعلق عالم اسلام میں مفکرین کی مختلف آراء پائی جاتی ہیں:

1 ......اسلامی مفکرین کی ایک بڑی جماعت نے حقوق انسانی کے مغربی تصور کو ہو بہو تسلیم کیا ہے۔ یہ مفکرین اسے حقوق انسانی کے لیے کی گئی مساعی کا معراج سمجھتے ہیں اور اس کی کسی دفعہ یا شق میں اسلامی تعلیم کے خلاف کوئی عنصر انھیں نظر نہیں آتا۔ عالم اسلامی میں پائے جانے والے مفکرین کا یہ وہ مکتب فکر ہے جو اپنے تہذیبی ورثے، اپنی شاندار اسلامی تاریخ اور روشن اسلامی قدروں کے بارے میں احساس کمتری کا شکار رہا ہے۔ یہ مکتب فکر اسلام کی ہر اس تعلیم کو جو جدید مغربی تہذیب کے خلاف ہو قابل نسخ یا قابل ترمیم سمجھتا ہے، صرف اس اسلام پر ایمان رکھتا ہے جو مغرب کے جدید رویوں کا ساتھ دے سکے اور نت نئے موسموں اور نئی ہواؤں میں پنپ سکے۔ یہ معیشت، معاشرت، اخلاق وعادات، لباس وہیئت...... ہر شے میں مغرب کی تقلید کرنے کا قائل ہے۔ ہندوستان میں اس مکتب فکر کے سرخیل سرسید احمد خان تھے، وہ لکھتے ہیں:

> ''جو شخص قومی ہمدردی سے اور دور اندیش عقل سے غور کرے گا، وہ جانے گا کہ ہندوستان کی ترقی، کیا علمی اور کیا اخلاقی، صرف مغربی علوم میں اعلیٰ درجہ کی ترقی حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں، تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیا کر دیں، ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہو جائے، یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم دن رات ہمارے دست وپا ہوں، ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں، ہم اپنی قدر، اپنی عزت کی قدر خود آپ کرنی سیکھیں، ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اس کو اپنا محسن ومربی سمجھیں''۔
> (مقالات سرسید، جلد ۵، ص ۶۶)

عالم اسلامی کے حکمرانوں کی تربیت بھی عموماً اسی مکتب فکر کے نہج پر ہوئی ہے......

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عالم اسلام کا یہ طبقہ فکر ونظر کے حوالے سے انتہائی مفلس اور پسماندہ ہے۔ اس کی اپنی کوئی فکر، کوئی سوچ، کوئی زاویہ نظر نہیں۔ جو مغرب نے کہا اور وہاں کے تہذیبی دریچوں سے جو کچھ آیا، اسے من وعن قبول کر لینے کو ہی یہ اپنے لیے مایۂ فخر سمجھتا ہے۔ یہ اسلام سے واشگاف لفظوں میں انکار کی جرأت بھی نہیں کرتا اور اس کی ٹھیٹھ صحیح تعلیمات پر عمل سے بھی قاصر ہے۔ مفکرین کا یہ مکتب فکر بنیادی طور پر مغرب کی مادی ترقی اور وہاں کی بعض پہلوؤں سے پر کشش منظم ندگی سے مرعوب ہے۔ اس مرعوبیت کے نتیجے میں وہ مذہبی تعلیمات اور اسلامی اقدار وروایات تیاگ دینے کی غلطی کر گیا، جب کہ مادی ترقی کے اسباب اور عناصرِ قوت کے حصول کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، وہ اسباب اسی محنت اور جدوجہد سے حاصل ہو سکتے ہیں جسے ترقی یافتہ قوموں نے اپنایا ہے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر سے نسبتاً ایک طویل اقتباس درج کیا جا رہا ہے، جس میں انہوں نے جدیدیت اور مغربیت سے مرعوب مفکرین پر بڑا جاندار تبصرہ کیا ہے، مولانا دریابادی خود مغربی علوم اور زبانوں کے ماہر تھے، وہ لکھتے ہیں:

''ماضی بعید کو چھوڑیئے انہی قریب اور حال کے زمانوں میں آ جائیے۔ چراغ علی اور سید امیر علی کو بھی جانے دیجیے۔ نادانستہ سہی، لیکن بہر حال کیسا کیسا اپنے ہاں کے عقائد اور مسائل کو یہ دونوں مسخ کر گئے ہیں! معاذ اللہ! سر سید کے خلوص و نیک نیتی میں کسے شبہ ہے؟ لیکن ساتھ ہی ان کے عقائد وتاویلات کے لچر اور غلط در غلط ہونے میں بھی کسے انکار ہے؟ مولانا شبلی نعمانی (اللہ انہیں اپنی رحمتوں سے نوازے) نے ان سے بچ کر چلنا چاہا، بچ سکے؟...... محمد علی لاہوری کا حال ان سے بدتر، غرض خالص متکلمین میں سے جس جس نے اس موضوع پر قلم اٹھایا، انجام کیا ہوا؟ یہی ہوا کہ:

چارہ گر ہو گئے مثال انہیں بیماروں میں!

جنہوں نے دوسروں کی شفا بخشی کے لیے مطب کھولا تھا، وہ خود ہی مبتلائے آزار نکلے تو وجہ کیا؟ وجہ یہ کہ پوری اور گہری تیاریوں کے بغیر اپنے نفس، جان، روح کے رگ و ریشہ کو ایمان کی خوشبو سے بسائے بغیر رسوخ فی الدین پوری طرح حاصل کیے بغیر، محض اپنی ذہانت وطباعی کے بھروسہ پر اسلام کی ایک اجمالی غیرت پر (اور بعض اوقات غیرت بھی تمام تر اپنی اسلامی نہیں ہوتی، محض ''قومی'' و ''ملی'' عصبیت ہوتی ہے، جو کفر و ایمان دونوں میں مشترک ہے) اس کام کو ہاتھ میں لیا جاتا ہے اور گو زبان سے اظہار صرف حمایت اسلام اور نصرت دین کا کیا جاتا ہے اور شعوری طور پر اکثر صورتوں میں نیت بھی فی الواقع یہی ہوتی ہے، لیکن دونوں کے اندر ایک چور دوسرا چھپا ہوا ہوتا ہے۔ کفر سے مرعوبیت کسی نہ کسی صورت میں ضرور موجود ہوتی ہے۔ باطل کا زرق برق لباس، ناحق کی رنگا رنگ چمک دمک، دل کی رنگا رنگ چمک دمک، دل کی گہرائیوں میں اثر خفی کی اندھیریوں میں ضرور اپنا اثر اندر رکھتی ہے۔ شروع میں تو بات ڈھکی چھپی رہتی ہے، لیکن جوں جوں کاروبار پھیلتا جاتا ہے، متکلم بیچارہ غیر شعوری طور اپنے اصلی مقام سے ہٹتا جاتا ہے۔ پیش نظر اب صرف یہ رہ جاتا ہے کہ اسلام کو زیادہ سے زیادہ ماحول وضروریات وقت کے مطابق ڈھال کر پیش کیا جائے، حقائق دین کو رنگ ایسا دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے، لباس ایسا پہنا دیا جائے کہ ابنائے عصر زیادہ سے زیادہ تعداد میں ادھر متوجہ ہو جائیں اور انکو عین اپنا مطلوب سمجھنے لگیں نہ یہ کہ حقائق دین بالکل اپنی جگہ پر رہیں، بڑے چھوٹے، اساسی وفروعی کسی مسئلہ میں سرمو فرق نہ پڑنے پائے، نہ مغز میں نہ قشر میں عام اس سے کہ کوئی ایک شخص ہی اس آواز کا سننے والا ملے یا نہ ملے، آخر پیغمبروں کی تبلیغی ناکامیوں کی شہادت کثرت سے قرآن دے رہا ہے یا نہیں؟ لیکن یہ متکلمین خام ناکامی کی تاب ہی نہیں لا سکتے۔ ان کا اپنا کلام اب مقصود بالذات ہو جاتا ہے۔" لیکن دنیا علماء راسخین سے کبھی خالی نہیں رہی۔ پہلے بھی اشعری باقلانی، غزالی ہوتے رہے ہیں، آج بھی تعداد میں قلیل سہی، لیکن بحمد للہ ہمارے درمیان زندہ سلامت موجود ہیں۔ مثال کے طور پر میں صرف دو نام عرض کروں گا۔ مولانا اشرف علی تھانوی اور مولنا شبیر احمد عثمانی صاحب کی کلامی تحریریں اٹھا کر دیکھ لیجیے، اپنی جگہ پر ثبات وخودداری کے چٹان نظر آئیں گے۔ جو نئے فلسفہ کو، ہر نئے نظریہ کو، ہر نئی آواز کو اپنے ہی معیار سے جانچیں گے، اپنے ہی پیمانہ سے ناپیں گے، جانچ کا معیار ان کا اپنا ہوگا، ناپ کا پیمانہ ان کا اپنا ہوگا۔ اس باب میں آپ ذرا بھی لوچ، لچک، جھکاؤ ان میں نہ دیکھیں گے۔ یہ نہ ہوگا کہ غیروں کے شاندار "نظریات" و "حقائق" کے سامنے اپنے ہاں کی چیزوں میں کھینچ تان شروع کر دیں، اور اگر کچھ نہ سہی تو کم از کم یہی ظاہر کرتے رہیں کہ اسلام کے مقرر کیے ہوئے اصطلاحات والفاظ تو اس بیسویں صدی کے مناسب حال نہیں! ان کی اس شدت وغلظت (سختی) سے یہ نقصان تو بے شبہ ہوتا ہے کہ جدید طبقہ ان پر حلقہ وار نہیں گرتا، انگریزی خوروں اور مغرب زدوں کا رجوع عام ان کی جانب نہیں ہوتا۔ لیکن ان کے فخر وعظمت کے لیے یہی بس ہے کہ ان کا بتایا ہوا دین وہی ہے، جو ٹھیک اللہ اور رسول کا بتایا ہوا دین ہے، بعد کی ہر آمیزش سے پاک، ہر آمیزش سے دور۔ ان کے پیش نظر صرف اسلام رہتا ہے، بیسویں صدی کا اسلام نہیں!" بیسویں صدی کا "اسلام"! آہ کتنا مغالطہ پرور فقرہ! کتنے اہل قلم اور اہل فکر ان سے قبل، اپنی ساری نیک نیتی اور مخلصانہ عزم کے باوجود اسی عصری اسلام کے مغالطہ میں پھنس چکے! اور اللہ کے محض فضل وکرم اور نری توفیق خداوندی کے بجائے اپنے دست وبازو پر اعتماد کر کے، اپنے زور قلم وقوت انشاء کے سحر میں مبتلا ہو کر، خود رائی کے شہید ہو چکے تھے! امیر علی اور سرسیدؒ دونوں اپنے اپنے خیال میں "انیسویں صدی کے اسلام" کی خدمت میں کس جوش، کس انہماک کے ساتھ لگے رہے تھے! ٹھہرنے کے لیے، جمنے کے لیے، نہ انیسویں صدی آئی تھی، نہ بیسویں صدی ہی آئی ہے، انیسویں صدی کے اس "عظیم الشان نظریہ" کو کتاب الٰہی خدا کا قول (Word of God) ہے اس وقت کی اصطلاح میں "قانون قدرت" خدا کا فعل، اس لیے قول خداوندی وفعل خداوندی میں تناقض ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس لیے خوارق عادت (یعنی معجزات) تمامتر ناقابل یقین ہیں، آج کون پوچھتا ہے؟ آج کہاں اس نظریہ کی پرکاہ کے برابر ہی قدر رہے؟ سرسید کی تفسیر خود علی گڑھ میں کون پڑھتا ہے؟ نیچریت، کا وجود بھی کہیں باقی رہ گیا ہے؟"

2 ...... عالم اسلام کے مفکرین کا دوسرا مکتب فکر وہ ہے جو مغربی تہذیب اور اس کے فلسفے کو یکسر رد کرتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور وہ اس کے ساتھ کسی طرح کی مصالحت، مفاہمت کے لیے تیار نہیں۔ وہ مغرب کے انسانی حقوق کے منشور کو اسلامی تعلیمات اور اسلام کے عطا کردہ حقوق العباد کی ضد سمجھتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مغرب کے انسانی حقوق کی بنیاد آزادی و آوارگی پر رکھی گئی ہے جب کہ اسلام کے عطا کردہ حقوق کا ڈھانچہ عبدیت و بندگی پر قائم کیا گیا ہے، آزادی اور بندگی دونوں جمع نہیں ہو سکتیں۔

یہ مکتب فکر مغرب کے خوشنما نعروں، خوب صورت عنوانات اور دل فریب ٹائٹلوں سے متاثر ہونے کی بجائے ان نعروں کی تہہ میں چھپی ہوئی اسلام دشمن سازشوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مغربی فلسفے کا خمیر ہی ایسے اصولوں سے اٹھایا گیا ہے جنھیں پیوند لگا کر بھی اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ اس کے نزدیک مغرب شرہی شر ہے اور اس کا تصورِ حیات ایک ملحد عقل کا شیطانی تصور ہے۔ یہ مکتب فکر اپنے مؤقف پر بڑے مضبوط دلائل رکھتا ہے، مثلاً انسانی حقوق کے بین الاقوامی منشور کا بنیادی ڈھانچہ امریکی دستور سے لیا گیا ہے لیکن خود امریکا انسانی حقوق کی پامالیوں، تباہیوں اور جنگ و فساد کی ایک بھیانک تاریخ رکھتا ہے۔ امریکی سفید فام نو آباد کاروں نے ملک کے اصل باشندوں "سرخ انڈین" کی پوری نسل صفحۂ ہستی سے مٹائی جس کی تعداد پون کروڑ سے زیادہ بتلائی جاتی ہے۔ جارج واشنگٹن نے اس موقع پر کہا تھا "ریڈ انڈینز انسانی لباس میں بھیڑیے ہیں، یہ انسان کہلانے کے مستحق نہیں"۔ ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے براعظم افریقہ سے پانچ لاکھ سیاہ فام باشندوں کو جانوروں کی طرح انھوں نے پکڑا اور جہازوں میں لاد کر امریکا پہنچایا، ان کی باقاعدہ خرید و فروخت ہوتی تھی اور ان کی باقی ماندہ نسل امریکا میں آج تک مساوی حقوق حاصل نہیں کر سکی۔ تیس دفعات پر مشتمل انسانی حقوق کے عالمی منشور کی ابتدائی پانچ دفعات یہ ہیں:

① تمام انسان آزاد پیدا ہوئے ہیں اور وقار و حقوق کے معاملہ میں مساوی الحیثیت ہیں۔

② ہر فرد نسل، رنگ، جنس، زبان، مذہب، سیاسی یا دوسرے نظریات، قومی و سماجی حیثیت، املاک، پیدائش یا کسی اور حیثیت اور کسی بھی قسم کے امتیاز کے بغیر اس منشور میں صراحت کردہ تمام حقوق اور آزادیوں کا مستحق ہوگا۔

③ ہر فرد کو زندہ رہنے، آزاد رہنے اور اپنی جان کی حفاظت کرنے کا حق حاصل ہے۔

④ کسی بھی شخص کو نہ غلام بنایا جائے گا اور نہ محکوم رکھا جائے گا۔ غلامی اور غلاموں کی تجارت کی ہر شکل ممنوع ہوگی۔

⑤ کسی بھی شخص کو تشدد، ظلم و ستم، غیر انسانی اور توہین آمیز سلوک یا سزا کا نشانہ نہیں بنایا جا سکے گا۔

لیکن امریکا کسی ملک کو آزاد رہنے کا حق دینے کے لیے تیار نہیں، اس نے پوری دنیا کی ناک میں دم کر رکھا ہے۔ افغانستان کی تباہی اور عراق کی تازہ جنگ دنیا کے سامنے ہے۔ کیمیائی ہتھیاروں کا ہوا کھڑا کر کے انسانوں پر تباہی مسلط کی گئی لیکن آج تک وہ ہتھیار برآمد نہیں ہو سکے۔ ابوغریب جیل اور گوانتاناموبے میں مسلمان قیدیوں کے ساتھ جو وحشت ناک سلوک ہو رہا ہے، اس کی تصاویر میڈیا پر پوری دنیا دیکھ چکی ہے، ظلم و بربریت کی اس دُھند میں انسانی حقوق کا چارٹر دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ انسانی مساوات کا کون سا تصور ہے کہ ایک ملک ہر تباہ کن ہتھیار بنا اور رکھ سکے لیکن کسی اسلامی ملک کے لیے اسے ناقابل معافی جرم بنا دیا جائے۔

مغرب کے لیے اس مکتب فکر کا رویہ معذرت خواہانہ نہیں بلکہ جارحانہ ہے۔ یہ مغرب کی ظاہری خوبیوں کو اس کے تاریک اور بھیانک پس منظر میں دیکھتا اور جانچتا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ اس کے ہر خوشنما سبزہ کی تہہ میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گندگی کا ڈھیر ہے۔

3 ......عالم اسلام کے مفکرین کا تیسرا مکتب فکر وہ ہے جو مغرب کے ساتھ مصالحت، مفاہمت اور سمجھوتے کی راہ پر گامزن ہوا چاہتا ہے۔اس کا کہنا ہے کہ مغرب خیر وشر دونوں کا مجموعہ ہے،اس کے خیر پر اس کے ساتھ بات کی جائے اور اس کے شر سے بچا جائے۔ یہ مکتب فکر گویا عربی کے مشہور محاورہ ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' (اچھائی لو، برائی چھوڑو) پر کاربند ہے۔اس کے نزدیک مغربی زندگی نے بہت ساری خوبیاں اسلام سے لے کر جدید طرز حیات میں سمودی ہیں۔ اس سمونے میں مغرب جن تجرباتی مراحل سے گذرا ہے، عالم اسلام کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

یہ بڑی حد تک صحیح فکر اور متوازن راہ عمل ہے لیکن اس کی پگڈنڈیاں بہت باریک اور پرخطر ہیں۔اس مکتب فکر کے کئی اسکالر مغرب کے ساتھ صرف خیر پر سمجھوتے کی بات کرتے ہیں لیکن وہ آنکھوں کو خیرہ کرنے والے اس کے شر سے بھی متاثر ہو جاتے ہیں، کبھی شعوری اور کبھی لاشعوری طور پر......اور مرعوب ہوتے ہوتے بالآخر اسی سوچ اور فکر کو اختیار کر جاتے ہیں جو پہلے مکتب فکر کا ہے یعنی مکمل مرعوبیت اور اندھی تقلید۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ،مغربیت سے متعلق عالم اسلام میں پائے جانے والے ذکر کردہ تینوں رویوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''مغربیت کے بارے میں جو وقت کا اصل چیلنج اور عالم اسلام کے لیے ایک استفہامیہ نشان ہے، مسلم ممالک کے تین ہی رویے ہو سکتے ہیں، خالص منفی اور سلبی رویہ (یعنی گویا مغرب سے لینے کی کوئی چیز نہیں اور اس کی ترقیات سے مکمل کنارہ کشی اور بے تعلقی ضروری ہے) خالص مثبت و ایجابی رویہ (مغربی تہذیب کو کلیۃً قبول کر لینا اور اس کو اپنے ملک میں جوں کا توں نافذ کر دینا) مغرب سے تہذیب کے بارے میں مستقل و مجتہدانہ کردار، مغرب سے استفادہ کے صحیح میدانوں کا انتخاب اور ان کے حدود کا تعین۔ مصنف کے نزدیک پہلا رویہ ناقابل اور ناکام ہے اور جس نے اس کو ابتدا میں اختیار کیا اس نے جلد وہ راستہ چھوڑ کر مغربی تہذیب کو اپنانے کا کام شروع کر دیا، دوسرا رویہ کسی اسلامی ملک اور قوم کے لیے غیر شایان شان اور نامناسب اور اسلامی تعلیمات و تہذیب سے بغاوت کے مرادف اور معنوی خودکشی ہے، تیسرا رویہ جس کے لیے ذہانت اور قوت ارادی۔ اور صحیح قیادت کی ضرورت ہے اور ایک مرد کامل مطلوب ہے، تنہا اسلامی ملک کو زیب دیتا ہے اور اسی میں اس وقت عالم اسلام کی حفاظت، نئے دور کی قیادت اور مسلمانوں کی قوت کا راز پنہاں ہے''۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مذہب کی کوئی تعلیم مادی ترقی کی راہ میں کبھی رکاوٹ نہیں بنی۔ زندگی کی جدید مادی آسائشوں کے حصول کے لیے محنت و جدوجہد کی ضرورت ہے۔ یہ منزل مذہبی تعلیمات تیاگ دینے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہ تلخ کام ترکی کا مصطفیٰ کمال پاشا کر چکا ہے۔ یورپ و مغرب کے رنگ میں رنگنے کے لیے وہ اپنے تشخص، اپنی قومی روایات، اپنی ترجیحات حتیٰ کہ اپنے رسم الخط تک سے دستبردار ہو گیا تھا لیکن اس کے مرنے کی آدھی صدی بیت جانے کے باوجود ترکی آج بھی وہیں کھڑا ہے جہاں کمال پاشا نے اسے چھوڑا تھا۔ کمال کا ہم خیال سیکولر طبقہ ہاتھ میں عرضی لیے یورپی یونین میں شامل ہونے کے لیے خداوندان مغرب کے سامنے سرنگوں ہے لیکن ترکی کے حصے میں ذلت کے سوا اور کیا آیا؟...... اس لیے روشن خیالی کا یہ تصور مسلمان معاشرے کو جہنم زار تو بنا رہا ہے، وہ اس کے لیے خیابانِ بہار کبھی نہیں بن سکتا۔

☆☆☆

© rasailojaraid.com